لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر

سلسلہ کیلئے ملاحظہ ہو بُرہان جنوری ۱۹۶۱ء

مولانا محمد تقی صاحب امینی صدر مدرس دار العلوم معینیہ اجمیر

(۲)

<u>گذشتہ مباحث کا خلاصہ</u> (۱) "نشاۃ ثانیہ" کی تحریک بڑی حد تک مسلمانوں کی مرہونِ منت ہے اس کے باوجود رومی و یونانی تہذیب و تمدن اس کی سرشت میں داخل ہے۔

(۲) ان دونوں تہذیبوں کی بنیاد میں مادی ذہنیت سرایت تھی اور روحانیت کا نہایت خفیف اثر تھا۔ (۳) نشاۃ ثانیہ کے اجزاء اس قدر وسیع اور متنوع تھے کہ ان کو کسی تنگ و تاریک مذہب میں سمیٹنا آسان نہ تھا۔

(۴) مروجہ مذہب کی اصلاح شدہ شکل اس قابل نہ تھی کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی "توانائی" کو واپس لاکر رہنمائی کے فرائض انجام دے سکتی۔ نیز مذہبی نمائندوں میں اس درجہ کی اخلاقی صداقت بھی نہ تھی کہ وہ اپنی شخصیت میں جاذبیت پیدا کر سکتے۔ ایسی صورت میں لامحالہ نشاۃ ثانیہ کے اجزاء کو آزادی و بیباکی کے ساتھ بروئے کار آنے کا موقعہ ملا اور حقیقی مذہب کے "کاز" کو نقصان پہونچا۔

<u>نشاۃ ثانیہ کو سمجھنے کے لئے چند توضیحی اشارات</u> | ذیل میں چند توضیحی اشارات کئے جاتے ہیں جن کے ذریعہ "نشاۃ ثانیہ" کا تجزیہ کرکے "لامذہبی دور" کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

(۱) اجتماعی زندگی کے "تاسیسی دور" میں مستقبل کی بڑی حد تک نشا نہی موجود ہوتی ہو لیکن اس کے ادراک اور صحیح سمت کے تعین کے لئے بڑی دقیقہ رسی اور باریک بینی کی ضرورت ہو۔ بسا اوقات ابتدا میں بعض ایسی چیزوں کی "نمود" نہیں ہوتی ہے جن کو "تعمیر" میں مخصوص مقام حاصل ہوتا ہے اور بہت سی ایسی چیزیں

اُبھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں جن کا بعد میں حالات کے دباؤ کی وجہ سے کوئی مقام نہیں باقی رہتا ہے۔

اس دور میں چونکہ اندرونی قوتیں رو بہ اصلاح ہوتی ہیں اور عوامی جوش وخروش اپنی تسکین کا جویا ہوتا ہے اُس لئے اُبھری ہوئی چیزوں سے تسلی حاصل کرکے دوسری گہری چیزیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

(۲) اجتماعی زندگی کا وہ دور نہایت نازک اور اہم ہوتا ہے جس میں وہ ایک موقف کو چھوڑ کر دوسرا موقف اختیار کرنے پر آمادہ ہوتی ہو۔ اس میں اگر فکر وعمل کو بلند نصب العین میسر آگیا اور دونوں کی صحیح حدیں اور سمتیں متعین ہوگئیں تو قوتوں کو "صداقتوں" کی شاہراہ پر چلانا آسان ہوتا ہے اور اگر سطحی نصب العین سامنے آیا اور فکر وعمل کو آزادانہ برگ وبار لانے کا موقع ملا تو اس سے نہ صرف یہ کہ قوتوں کے استعمال کا رُخ بدل جاتا ہے بلکہ آگے چل کر مسلمہ صداقتوں کی تبدیلی بھی ناگزیر بن جاتی ہے کہ اس کے بغیر بے لگام عقل وہوس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اور کوئی شکل نہیں ہوتی ہو۔

(۳) فکر وعمل کی نئی دنیا بسانے میں زندگی کے ان "تاروں" کو چھیڑنے کی سخت ضرورت ہوتی ہے جو عقل کو جذبات پر تحکمد بناتے ہیں۔ نیز عقل وقلب کا "آمیزہ" تیار کرکے زندگی کے اہم مسائل میں اس سے رہنمائی ناگزیر ہوتی ہے۔

اگر ان سے غفلت برتی گئی اور ایمان و وجدان کی وہ کیفیت نہ پیدا ہوسکی جو غیر شعوری طور پر حقیقت کا احساس کراتی ہے تو نہیں کہا جا سکتا کہ زندگی کا "دھارا" کس تیزی کے ساتھ اور کس سمت جا پڑے گا؟ پھر قوی اندیشہ ہے کہ بنیادی اقدار اور مسلمہ صداقتوں وغیرہ الفاظ بے معنی ہو کر رہ جائیں اور زندگی کے نئے انداز میں توجیہ ہو کر اسی کی رہنمائی میں مسائل حل ہونے لگیں۔

(۴) زندگی کی گاڑی کبھی ٹھہرتی نہیں ہو یا وہ آگے بڑھے گی یا پیچھے ہٹے گی۔ اس کے چلانے کے لئے ایسے تجربہ کار "ڈرائیور" کی ضرورت ہوتی ہے جو نہ صرف یہ کہ ہر موقف وہر موڑ کے نشیب وفراز سے واقف ہو بلکہ گاڑی کی رفتار اور "بریک" پر اس کو قابو حاصل ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا اور احساس وجذبات کو آزادی مل گئی تو اسٹیم (احساسات وجذبات) کی طاقت زندگی کی گاڑی کو کہیں سے کہیں پہونچا دیگی اور پھر اسٹیئرنگ کنٹرول

مشکل ہوجائے گا ۔ ان توضیحات کی روشنی میں جب ہم "نشاۃ ثانیہ" کی گہرائی میں جاکر اس کی پُرپیچ اور عام نظروں سے اوجھل "تہ" کا پتہ لگاتے ہیں تو ذیل کی چند حقیقتیں نمودار ہوتی ہیں ۔

نشاۃِ ثانیہ کی تاسیس میں تین چیزوں کو زیادہ اہمیت حاصل تھی

(۱) "نشاۃِ ثانیہ" میں رومی و یونانی تہذیب و تمدن سے جو چیزیں برآمد کی گئی تھیں اُن میں دیگر علوم و فنون کے ساتھ (۱) فکر و ضمیر کی حریت (۲) مادی ذہنیت اور (۳) ذوق حسن و لطافت کو زیادہ اہمیت حاصل تھی ۔ یہ تینوں زندگی کے لئے جس قدر ناگزیر ہیں اس سے زیادہ خطرناک ہیں اگر اُن کو آزادی و بیباکی کے ساتھ برگ و بار لانے کا موقع ملا تو ان کی وحشتناکی و ہوسناکی کے وہ مناظر سامنے آئیں گے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ جائے گی اور اگر ان کے استعمال میں فطری حدود و قیود کا لحاظ رکھا گیا تو پھر ان سے زیادہ نفع بخش اور سودمند کوئی چیز نہیں بن سکتی ہو ۔ "نشاۃ ثانیہ کی تاسیس میں ان تینوں کو مستقل مقام حاصل ہوا اور کسی خاص مزاحمت کے بغیر برگ و بار لانے کا موقع ملا ۔ ابتدا میں چونکہ تو تیں تعمیر کی طرف زیادہ متوجہ تھیں اس لئے اثرات اس قدر نمایاں شکل میں نہ ظاہر ہوسکے کہ موثر انداز میں غور و فکر کے لئے مجبور کرتے اور حد بندی و پابندی کے لئے کوئی سبیل نکالی جاتی ۔ بعد میں جب ان کے حالات زیادہ سازگار رہے اور عقل و ہوس کی جولانیاں بے قابو ہوکر کھلے بندوں خرمنِ امن و انسانیت کو جلانے لگیں تو بندش کے لئے وعظوں اور لیکچروں سے کام لینے کی کوشش ہوئی ۔ حالانکہ وہ دور گذر چکا تھا جس میں وعظ و لیکچر زندگی میں اہم پارٹ ادا کرتے ہیں ۔

نشاۃ ثانیہ کی وسعت و فراخی کی مناسبت سے زندہ و بلند پایہ مذہب نہ میسر آیا تھا

"نشاۃِ ثانیہ" میں ذہنی و فکری نشو و نما جس وسعت و فراخی کے ساتھ ہو رہی تھی اس کی مناسبت سے رہنمائی کے لئے ایک زندہ و بلند پایہ مذہب کی ضرورت تھی جو فکری و عملی میدان میں زندگی کے حقائق سے ہم آہنگ ہو اور جس کی تعلیمات "انفس" میں تبدیلی کے ساتھ فطرت و کائنات کے سربستہ رازوں کی تحقیقات سے دلچسپی ظاہر کرتی ہوں ۔ اسی قسم کا مذہب موقع کی مناسبت سے فکر و عمل کے لئے بلند نصب العین عطا کرسکتا تھا اور یہی "نشاۃِ ثانیہ" کے وسیع و متنوع اجزا کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی ہمت کرتا ۔ لیکن مروجہ عیسوی مذہب کی زندگی کش پالیسی اور صلیبی جنگوں سے پیدا شدہ رقابت کی وجہ سے نئی دنیا کو

یہ مذہب نہ میسر آسکا۔ ادہر جو قوم اس مذہب (اسلام) کی حامل تھی وہ جوانی سے گذر کر ضعیفی کے دور میں داخل ہو چکی تھی جس کی وجہ سے یہ مذہب اپنی تمام تر بلندیوں اور ترقیوں کے باوجود اصلی شان و شوکت کے ساتھ نہ دکھائی دیتا تھا۔

ان وجوہات کی بنا پر نئی دنیا اس مذہب کی صحیح رہنمائی قبول کرنے سے قاصر رہی، حالانکہ حقیقت بیں نظروں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہو کہ صلیبی جنگوں اور اس مذہب کے اقتدار کی بدولت جو زریں خیالات و عہد آفریں "نوادرات" برآمد کئے گئے ہیں وہ نئی دنیا کی تاسیس و تعمیر میں کس قدر اہم کردار کے حامل بنے ہیں؟ نئی دنیا مروجہ عیسوی مذہب کی زندگی کش پالیسی کے باوجود اس کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئی اور کسی نہ کسی طرح اسی سے تسکین حاصل کرتی رہی، کیونکہ ترکِ مذہب سے زندگی کے کچھ "خانے" خالی ہو جاتے ہیں اور فطری طور پر ایک خاص قسم کا خلا محسوس ہونے لگتا ہے، جن کو مذہب ہی پُر کر سکتا ہو۔ اس کے علاوہ نئی زندگی میں جس قسم کے خیالات و افکار پرورش پا رہے تھے اور اُن سے جیسی معاشرتی زندگی نمودار ہونے والی تھی اس کے ساتھ سمجھوتہ کے لئے ایسا ہی مذہب درکار تھا کہ جس سے وقت ضرورت نفس کی تسکین کا کام تو لیا جاتا رہے باقی اور حالات و معاملات میں وہ دخیل نہ بن سکے۔ ایسا نہیں ہوا کہ مذہب کی طرف سے بالکل غفلت برتی گئی ہو۔ اس دور ترقی میں مذہب کی اصلاح و ترقی کی طرف بھی توجہ ہوئی اور وقتاً فوقتاً مختلف تحریکیں نمودار ہوتی رہیں لیکن اس کی اُبھری ہوئی ناکامی نے کسی تحریک میں قوتِ جاذبہ نہ پیدا ہونے دی۔

محض نفس کی تسکین کے لئے مذہب سے کوئی بات نہیں بنتی ہی

(۳) نفس کی تسکین کے لئے بے جان عقیدہ و چند مراسم و اعمال کی نمائش سے مذہب کے تحفظ و بقاء کی ضمانت نہیں ہو سکتی ہے۔ اصل چیز مغز شریعت اور مذہب کا بنیادی فکر ہے۔ جب تک ان کو زندگی میں رچایا اور بسایا نہ جائے اس وقت تک مذہب فکری و عملی میدان میں کوئی انقلاب لا سکتا ہے اور نہ ہی زندگی میں کوئی خاص مقام پیدا کر سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ "نشأۃ ثانیہ" میں مذہب کی مذکورہ حیثیت سے عقل کو جذبات پر فتحمند بنانے کا کام نہ لیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح اُس کے ذریعہ ایمان و وجدان کی کیفیت پیدا ہونے کی توقع بھی بیکار تھی۔

جس مذہب کی قوتِ جاذبہ ختم ہوچکی ہو اور جذبی صلاحیتیں پامال ہوگئی ہوں اس کو اس دور میں فکر و عمل کے میدان میں لانا خود مذہب دشمنی کو دعوت دینا تھا۔ "نشاۃ ثانیہ" کے قاموس نگار غالباً اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں کہ مذہبِ عیسوی کی ناقص اور مایوس کن صورت بڑی حد تک لامذہبی دور کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ہے۔

نشاۃِ ثانیہ کو حالات کی مناسبت سے قائدین نہ مہیا ہو سکے تھے

(۴) "نشاۃِ ثانیہ" میں زندگی کی گاڑی چلانے کے لئے ایسے تجربہ کار ڈرائیور نہ مہیا ہو سکے جو احساس و جذبات (اسٹیم کی طاقت) کا صحیح اندازہ کرکے استعمال و طریقِ استعمال کیلئے کوئی لائحہ عمل تجویز کرتے جس سے یہ طاقت معتدل انداز میں خرچ ہوتی رہتی نہ بے موقع خرچ ہوتی اور نہ ضرورت سے زیادہ خرچ کی جاسکتی۔

اس وقت جو ڈرائیور (قائدین) سامنے آئے وہ قوم کی پچھلی محرومیوں اور ناکامیوں سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کے پیشِ نظر صرف زندگی کی گاڑی چلانا تھا۔ سمت کے تعین اور رفتار کے توازن سے انہیں زیادہ سروکار نہ تھا۔ یا ان قائدین (ڈرائیور) نے قیادت کی باگ سنبھالی جو احساس و جذبات کی نیرنگیوں اور عقل کی چیرہ دستیوں سے اس قدر مرعوب تھے کہ ان میں اتنی سکت نہ تھی کہ موجودہ سطحوں سے بلند ہوکر زندگی کے لئے گائیڈ بک (Guide Book) تیار کرنے اور اس میں جذب ہونے کو زندگی اپنی سعادت سمجھتی۔ ان کے علاوہ مذہبی ذہنیت کو کم کرنے میں ایک اور موثر کارفرمائی رہی ہو اور وہ جگہ و مقام کی مناسبت ہو۔

نشاۃِ ثانیہ میں جگہ اور مقام کی مناسبت بھی اثر انداز ہوئی ہو

"نشاۃِ ثانیہ" کی ابتدا و ترقی دونوں "اطالیہ" میں ہوئی، وہیں سے یورپ کے تمام ملکوں میں اس تحریک کی اشاعت ہوئی ہے۔

"اطالیہ" اپنے محل وقوع اور سرزمین کے لحاظ سے اس نئی تحریک کے لئے زیادہ موزوں تھا کیونکہ اس میں رومی تہذیب و تمدن کا اثر سب جگہوں سے زیادہ نمایاں تھا۔ خود "روما" اپنی ہوسناکیوں اور سرمستیوں کی داستان و یادگار لئے اطالیہ ہی میں واقع تھا (جس کے تفصیلی حالات کے لئے "تاریخ زوالِ روما" کا مطالعہ کرنا چاہیئے)۔

ایک طرف "روما" میں عروجِ حکمت کے نقوش وخطوط موجود تھے کہ جب فلسفۂ یونان کی شمع "ایتھنز" میں گل ہوئی تو اس حکمت کے آفتاب نے وہیں طلوع کیا تھا اور دوسری طرف قانون و اخلاق میں باہمی تفریق کے "نمونہ" بھی موجود تھے کہ اُس نے اپنی ترقی کے زمانہ میں قانون کو اخلاق سے متمیز کرنے اور عام قانونی تنظیم کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

غرض ان حالات و مؤثرات کی بنا پر "نشاۃِ ثانیہ" میں مذہبی ذہنیت کو کوئی قوت نہ پہونچ سکی اور مختلف محرکات کی بنا پر لا مذہبی ذہنیت کو قوت کے ساتھ فروغ حاصل ہوتا گیا۔

جدید دور میں فروغ پائے ہوئے چند نظریات

جدید دور کے چند نظریات

یہ دور تقریباً سترھویں صدی سے انیسویں صدی تک شمار ہوتا ہے۔ اس میں "نشاۃِ ثانیہ" کی مذکورہ ذہنیت اور اس کی کوششیں بڑی حد تک بار آور دکھائی دیتی ہیں اور ایک ایسی زندگی کی تنظیم ہو جاتی ہے جو پرانی زندگی پر بہرصورت "نقاد" نظر آتی ہے۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ناقص و کامل نظام بغیر اپنے مستقل فلسفہ کے زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ اس بنا پر لازمی طور سے نشاۃِ ثانیہ کو اپنے تحفظات کا بندوبست کرنا تھا ورنہ چند ہی دن میں اس ذہنیت پر تعمیر کی ہوئی عمارت کا منہدم ہو جانا یقینی تھا۔

ذیل میں "دورِ جدید" کے چند وہ نظریات درج کئے جاتے ہیں جو بحیثیت مجموعی فلسفۂ حیات کی تشکیل میں اس انداز سے فروغ پائے ہیں کہ علمی و عملی شعبوں میں انھیں کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلیگا کہ بعض کے تحت الشعور اور بعض میں کھلے بندوں کس قدر لا مذہبی ذہنیت کی "رونمائی" ہے اور پھر یہ فیصلہ کرنا آسان ہوگا کہ حقیقی مذہب اُن کے ساتھ کیونکر سمجھوتہ کر سکتا ہے؟ اور کس حد تک انھیں سمو کر اپنے "کاز" کو آگے بڑھا سکتا ہے۔ وہ نظریات یہ ہیں:۔

نظریۂ قومیت کا موجد

(۱) نظریۂ قومیت و وطنیت۔ یہ نظریہ ماکیاویلی (Machiayelli) کی طرف منسوب ہے حالانکہ اس کا موجد "ماکیاویلی" نہ تھا بلکہ یہ رومی تصور تھا جو دیگر علوم و فنون کے ساتھ روم سے برآمد کیا گیا تھا۔ لیکن چونکہ نئے دور میں "ماکیاویلی" نے اس کو نئے انداز میں پیش کیا اور ہر معاشرہ

نے اپنی تہی دامنی کی وجہ سے اجتماعی فلسفہ کی حیثیت سے اُس کا خیر مقدم کیا اس بنا پر اس کی طرف نسبت اور شہرت ہو گئی۔

نظریۂ قومیت کا تجزیہ | اس نظریہ کا تجزیہ کرنے سے اصل حقیقت کا سراغ لگانا آسان ہوگا "ماکیاویلی" کے نزدیک قومی مملکت کائنات کی اعلیٰ ترین ہستی اور انسان کی اصلی غرض وغایت ہے۔ وہ نفس و قوت کی خاطر ترقیِ قوت کا پرستار ہے اس سے بحث نہیں کہ یہ قوت کس سمت میں کام کرے گی۔ اس کی نظر میں سلطنت نہ اخلاقی ہے اور نہ قانونی بلکہ وہ محض سیاسی ہے اور اسی معیار سے سلطنت کے تمام کاموں کا جائزہ لینا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں مذہب۔ اخلاق اور قانون کو خاطر میں لانے کی ضرورت نہیں[۵۱]۔ چنانچہ وہ کہتا ہے

"سلطنت کے قیام وبقا کے لئے رئیس کو اکثر اوقات معاہدوں 'نیک نیتی' انسانیت اور مذہب کے خلاف عمل کرنا چاہیئے"[۵۲]۔

ایک اور جگہ ہے:۔

"جب ملک کی ہستی معرضِ خطر میں ہو تو انصاف اور ناانصافی رحم اور ظلم قابلِ ستائش اور شرمناک فعل کسی کا اطلاق نہیں ہوتا اور ان میں سے کوئی راہ عمل میں حائل نہ ہونا چاہیئے۔ تمام "موانع" کو برطرف کرکے وہی راہ اختیار کرنی چاہیئے جس سے ملک کا وجود اور اس کی آزادی قائم رہے۔ جو شخص اخلاق کے عام تصورات سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا اس کے لئے انفرادی زندگی ہی درست ہے اور اسے حکمرانی کی جرأت نہیں کرنی چاہیئے"[۵۳]

نظریۂ قومیت میں مذہب کی مستقل حیثیت نہیں ہے | نظریۂ قومیت میں مذہب کی مستقل حیثیت نہیں ہے البتہ وہ سیاست کا ماتحت اور خدمتگزار بنکر رہ سکتا ہے اور جب کبھی دونوں کے مفاد میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو تو سیاسی مفاد کو بہرحال ترجیح حاصل ہوگی۔

بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نظریہ کے ذریعہ سیاست کو مذہب سے آزادی مل گئی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ اپنے برگ وبار لانے کی خاطر اُس نے خلافِ اخلاق اور خلافِ قانون طرزِ عمل کی حوصلہ افزائی کی ہے نیز سیاسی دستور سے اس عنصر کو خارج کر دیا ہے جس سے انسانیت نشو و نما حاصل کرتی ہے۔

---

۵۱ نظریۂ سلطنت ص ۲۷، ۲۸ ۵۲ تاریخ یورپ ص ۱۳۸ ۵۳ تاریخ فلسفۂ جدید جلد اول ص ۲۶

نظریۂ قومیت کے فروغ پانے میں وقت اور فضا کی سازگاری کو زیادہ دخل ہو

کسی نظریہ کے فروغ پانے میں اس کی جاذبیت اور افادی حیثیت سے کہیں زیادہ وقت اور فضاء کی سازگاری کو دخل ہوتا ہے۔ تاریخ میں بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ حالات کی سازگاری کی بناپر معمولی اور تھرڈ کلاس نظریات کو اس قدر فروغ ہوا کہ ظاہر بیں نظریں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ اسی طرح حالات کی ناسازگاری کی بناپر نہایت اونچے اور بلندپایہ نظریات کو سسک سسک کر دم توڑنے کی مثالیں بھی بکثرت موجود ہیں۔ "ماکیاویلی" نے جس وقت نظریۂ قومیت کی تہذیب و تنقیح کی اور نئے ذہن کے لئے اس کو قابلِ قبول بنایا اُس وقت زندگی ایک ایسے "موڑ" پر تھی کہ مروجہ پُرانے اقدار سے وہ مایوس ہو چکی تھی اور نئے اقدار کا ابھی تعین نہ ہوا تھا لامحالہ اس کو کسی "سطحِ نظر" کی تلاش تھی کہ اس کی رہنمائی میں سمت کا تعین کر کے رفتار کو تیز کر سکے۔

چنانچہ نظریۂ قومیت کی رہنمائی میں نئی زندگی کا کارواں آگے بڑھا اور مذہب سیاست کا آلہ کار بن کر محض تسکینِ نفس اور آرائشِ محفل کے لئے باقی رہ گیا۔ اسی قسم کے مذہب کو ڈاکٹر "مربیر" (فلسفۂ جذباتِ کلام) نے کوئی اہمیت نہیں دی اور کہا ہے کہ "جذبۂ مذہبیت محض آرائش و تکلفات کا کام دیتا ہے اور جماعت کے لئے کوئی افادی حیثیت نہیں رکھتا ہے"[1] کیونکہ اس مرحلہ میں مذہب کی افادی صلاحیتیں بڑی حد تک پامال ہو جاتی ہیں اور اقدام۔ عزم۔ شجاعت وغیرہ زندگی کے عناصر تقریباً سب رخصت ہو جاتے ہیں۔

الغرض نظریۂ قومیت کے فروغ پانے کے بعد اہلِ سیاست کی مستقل جماعت تیار ہو گئی جو قومی و ملکی فلاح و بہبود کو مذہبی خیالات پر ترجیح دیتی تھی۔ پھر اس جماعت نے چند رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقہ کے مذہبی لوگوں کو اس غرض پر متحد بنالیا کہ حکومت کی بنیاد مذہبی رواداری پر رکھی جائے۔ نیز حکومتی مفاد کو مذہب پر ترجیح حاصل ہو۔ اس طرح مذہب و سیاست کے اشتراک سے اس نظریہ کو برگ و بار لانے میں کافی سہولتیں ہو گئیں۔

نظریۂ قومیت نے زندگی کے عناصر پیدا کر دیئے تھے

نئی دنیا نے اس نظریہ کو بطور "نصب العین" اپنا یا تھا اور جب کوئی شے نصب العین بن کر سامنے آتی ہے تو نفسیاتی طور پر زندگی کے لئے اپنا خاص زاویۂ نگاہ عطا کرتی ہے۔ پھر اسی کے ماتحت اخلاق و کردار کے ضابطوں کا تعین ہوتا ہے۔

[1] فلسفۂ جذبات صـ ۱۱۲ از عروج و زوال کا الٰہی نظام صـ ۱۳۳

یہ ناممکن ہے کہ کسی شے سے محبت کی جائے اور اپنی جدّوجہد کا مرکز اس کو قرار دیا جائے اس کے باوجود اس شے کے تقاضے اور مطالبے اُبھر کر نمودار نہ ہوں اور زندگی میں خاص مقام وہ نہ پیدا کر سکیں۔

اس قاعدہ کے مطابق "نظریۂ قومیت" نے خرابیوں کے ساتھ زندگی میں خوبیاں بھی پیدا کیں۔ مثلاً یکجہتی اتحاد۔ تنظیم۔ قربانی وغیرہ اوصاف۔ اسی طرح اقدام۔ عزم۔ شجاعت وغیرہ "جواہر" کہ ان کے بغیر کوئی نظریہ بروئے کار آسکتا ہے اور نہ ہی کوئی قوم قیام و بقار کی ضمانت حاصل کر سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اخلاق و کردار کا جو "ضابطہ" اس نظریہ کے مطابق ترتیب دیا گیا وہ نہایت تنگ اور بڑی حد تک قوم و جماعت کے افراد میں محدود رہنے والا تھا۔ لیکن اس حقیقت سے کس کو انکار کی جرأت ہو سکتی ہے کہ انھیں اوصاف و جواہر کی بدولت قوم و جماعت کی اقتصادی، فوجی اور سیاسی قوت ترقی کر جاتی ہے اور پھر یہ قوم و جماعت دنیا کو ذہنی و فکری اور سیاسی لحاظ سے اپنا غلام بنانے کے لئے مجاز قرار پاتی ہے۔

نظریۂ قومیت کی سطحیت کے اثرات

دراصل ہر شے کی طرح اخلاق و کردار بھی اثرات و خواص ہوتے ہیں جب یہ پائے جائیں گے تو لازمی طور سے اپنے اثرات و خواص مرتب کریں گے خواہ مذہب و قومیت کے نام پر ان کا وجود ہو یا اور کسی نام پر ہو۔ البتہ ظرف و محل اور ماحول کے لحاظ سے تفاوت ناگزیر ہوگا۔ یعنی اگر ذہنی و فکری نشو و نما بلند نصب العین کے ماتحت ہوئی ہے اور اندرونی قوتوں کی حدوں اور سمتوں کے تعین میں کسی قسم کی سطحیت نہیں پائی گئی ہے تو اخلاقی صداقتوں کی شاہراہ نہایت وسیع اور بلند ہوگی اس میں عالم گیر افادیت اور عمومی رحمت کی روح کارفرما ہوگی اور اگر ایسا نہیں ہوا بلکہ سطحی نصب العین سامنے آیا اور اسی کے ماتحت حدیں اور سمتیں متعین ہوئی ہیں تو لازمی طور سے سطحیت کا اثر اخلاقی صداقتوں کے مظاہرہ میں ظاہر ہوگا بلکہ آگے چل کر محل اور ماحول کے دباؤ کی وجہ سے یہ صداقتیں غلط رُخ اختیار کر لیں گی اور بڑی حد تک اپنی "افادیت" کھو دیں گی۔

نظریۂ قومیت نے اپنی سطحیت کی بنا پر پہلے ہی مرحلہ میں ایک ایسے محل و ماحول کی حوصلہ افزائی کی ہے جس میں جھوٹ، مکر، دغا، فریب، ظلم، بددیانتی وغیرہ "جرائم" کی پرورش ہوا اور سیاسی مفاد کے حصول کے لئے

اُن اقدار کے پامال کرنے کی تاکید کی ہو جن سے انسانیت نشو ونما پاکر بالیدگی حاصل کرتی ہے۔ ایسی حالت میں کیونکر ممکن ہو کہ صداقتیں اپنی اصلی حالت پر برقرار رہیں گی؟ پھر اس "نظریہ" کے مطابق اخلاق و کردار کے جس ضابطہ پر عمل درآمد ہوتا ہو وہ محض قومی پیمانہ پر ہوتا ہے۔ دوسری قوموں کے لئے وحشت و بربریت کے مظاہرہ میں کوئی تکلف نہیں ہوتا ہے۔ غرض خطرناک عصبیت و منافرت قوموں کی باہمی رقابت دوسروں کو فنا کرنے کے جذبات وغیرہ اس نظریہ کے ناگزیر نتائج ہیں جن کا موجودہ دنیا میں بآسانی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

مزید وضاحت کے لئے ماکیاویلی کی زندگی کے حالات

ذیل میں اس نظریہ کی مزید وضاحت کے لئے "ماکیاویلی" کی زندگی کے اجمالی حالات کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ "نظریہ" شخصی حالات سے بھی کافی متاثر ہوتا ہے۔ اور "نمائندہ" کی سطحیت اس کو بلندی (اگر فی الواقع ہو) سے پستی کی طرف لے آتی ہے۔

"ماکیاویلی" اطالیہ" کے شہر فلارنس "Florence" میں ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۲۷ء تک زندہ رہا۔ عنفوانِ شباب ہی میں اپنے شہر کی حکومت میں سیاسی خدمت اختیار کی اور بادشاہوں کے پاس بطور سفیر بھی بھیجا گیا جس سے دنیا کے تجربات و حالات معلوم کرنے کے مواقع فراہم ہوئے۔ جس دور میں یہ شخص سیاسی خدمت پر مامور تھا اطالیہ کی سیاست میں دغل و فریب سازش و حسد، بغض اور ظلم وغیرہ "جرائم" کو بڑا دخل تھا۔ ان چیزوں سے اس کی زندگی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی بلکہ یہی چیزیں بڑی حد تک اس کی ذہنی ارتقار کے لئے مہلک ثابت ہوئیں۔

۱۵۱۲ء میں جب اطالیہ انقلاب کی لپیٹ میں آیا اور "فلورنس" کی آزاد حکومت مسٹر میڈیچی (Medici) نے تہ و بالا کر دیا تو "ماکیاویلی" کو سیاسی خدمت سے سبکدوش کر دیا گیا اور مجبوراً اس کو خلوت کی زندگی بسر کرنی پڑی۔ اسی خلوت کے زمانہ میں اس نے اپنی مشہور کتاب "پرنس" (The Prince) لکھی جو اس کی شہرت کا باعث بنی۔

"ماکیاویلی" کی زندگی کے حالات و خیالات کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑا مفکر و

فلسفی تھا اور نہ ہی سیاست دانی میں اس کو امتیازی مقام حاصل تھا۔

وہ ایک لذت پرست شاعر تھا اور شاعروں ہی میں زندگی بسر کرتا تھا۔ البتہ صرف جمالیاتی حد میں اس کی تسکین کا باعث نہ تھیں بلکہ قوت و عظمت کی "نشأۃ" کا بھی طلبگار تھا۔ اس کی پست ذہنی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشہور کتاب "پرنس" اس نے خاص "میڈیچی" کو خوش کرنے کے لئے لکھی تھی اور صرف ایک خاندان کی سیاسی قوت اس کے مدنظر تھی۔

دراصل یہ شخص اپنی سطحیت و کم ظرفی کی بنا پر واقعات کی صرف ظاہری سطح کو دیکھ کر حالات کا تجزیہ کرتا تھا اور اشیاء کی گہرائی میں پہونچ کر حقائق کا پتہ لگانے کا عادی نہ تھا۔ نیز ذرائع میں اس قدر گم ہو جاتا کہ مقصد اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ نہ صرف مذہب کو کوئی روحانی طاقت نہیں سمجھتا ہے بلکہ ان تمام تصورات سے عاری نظر آتا ہے جن کے ذریعہ تخلیقی قوتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں[1]

بعد کے جن بعض مورخین و مصنفین نے "ماکیاویلی" کو عظیم انسان قرار دیا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ مذکورہ سطح سے بلند تھا یا اس کی شخصیت میں "صداقت" کی روح کارفرما تھی۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے پیش کئے ہوئے "نظریہ" کو حالات کی سازگاری کی بنا پر قوت و اقتدار حاصل ہوا اور یہ واقعہ ہے کہ قوت و اقتدار اپنے جلو میں تمام رعنائیوں و دلفریبیوں کو سمیٹے ہوتے ہیں اور خامیوں و کمزوریوں کو دیکھنے کے لئے نگاہوں میں تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

---

[1] ملاحظہ ہو ترجمہ تاریخ فلسفۂ جدید جلد اول مصنفہ ڈاکٹر ہیرلڈ ہوفڈنگ۔

ماسٹر رام چندر

اردو نثر کے ارتقاء میں اُن کا حصّہ

مولفہ

ڈاکٹر سیدہ جعفر

قیمت :۔ تین روپے ۔ دس نئے پیسے

ملنے کا پتہ :۔ ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۔ ایوان اُردو ۔ حیدرآباد ۔ آندھرا پردیش۔